ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

چند یادیں

جون ۱۹۶۴ء کے اوائل کی بات ہے، میں فقہ اسلامی کی تدوین کے منصوبے پر کام کا آغاز کر چکا تھا کہ محترم مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی (جن سے میں اس وقت فقہ پڑھ رہا تھا) کی معیت میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے) سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، مولانا محمد ادریس صاحب نے مولانائے محترم سے میرا مختصر تعارف کرایا، پھر میں نے مولانا کو تدوینِ فقہ اسلامی کے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے ان سے رہنمائی اور تعاون کی درخواست کی، مولانا نے تدوینِ فقہ اسلامی کی ابتدائی تاریخ پر نہایت روانی کے ساتھ مختصر روشنی ڈالی اور فقہ کی تدوینِ جدید کے سلسلے میں چند اصول بیان فرمائے، آخر میں امام علاء الدین الکاسانی (متوفی ۵۹۵ھ) کی مشہور کتاب ''بدائع الصنائع'' کو بنیاد بنا کر کام کرنے کا مشورہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ: ہمارے استاد حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ الکشمیری کو فقہ میں ''بدائع'' بہت پسند تھی، یہ مولانائے موصوف سے ان کی مختصر نشست گاہ میں میری پہلی اور طویل ملاقات تھی۔

مولانا کی نورانی صورت، مسکراتا ہوا روشن چہرہ، شفقت سے بھرپور آنکھیں، عالمانہ مگر شگفتہ اور تیز اندازِ گفتگو، عام محبت انگیز رویہ، آنے والے مہمان کی عزت و توقیر اور خاطر و تواضع ان سب باتوں نے مل جل کر مولانا کی باوقار شخصیت سے بہت متاثر کیا، درحقیقت میں ان سے مل کر بہت خوش اور مسرور تھا اور مجھے تدوینِ فقہ کی منزل آسان نظر آنے لگی۔

دوسری ملاقات چند روز بعد ہوئی، مولانا مسجد میں تھے، میں وہیں پہنچ گیا، مولانا محبت و شفقت سے پیش آئے، میں نے اجازت لے کر بغرض تصحیح تدوین فقہ اسلامی کے دس رہنما اصول (جو میں نے مولانا کے ارشادات کی روشنی میں مرتب کئے تھے) پڑھ کر سنائے، ایک آدھ جگہ ترمیم کی اور تعریف کی، یہ دس رہنما اصول مجموعہ قوانینِ اسلام جلد اول میں بیان ہوئے ہیں۔

میں نے اس ملاقات میں مولانا سے تعاون کی پھر درخواست کی' مولانا نے فرمایا کہ: ''تم کام کرو، جو کچھ مدد ہم سے ہو سکے گی، ضرور کریں گے۔'' اس وقت تک شاید مولانا کو یہ علم نہ تھا کہ یہ کام حکومت کے قائم کردہ ''ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی'' کے زیر اہتمام کر رہا ہوں' کیونکہ جوں ہی ان کو ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی سے میرے تعلق کا علم ہوا، میں نے محسوس کیا کہ ان کے رویئے میں تبدیلی آ گئی' کیونکہ وہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے (انصاری مرحوم نہیں) جو اس وقت ادارہ کے ڈائریکٹر تھے' بہت سخت ناراض تھے اور اسی نسبت سے ادارے سے بھی کہ یہ ادارۂ تحقیقات نہیں' بلکہ ''تحریفات'' ہے۔ اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن یہودی سازش کے تحت اسلام کے مسلمات کو مشکوک بنانے اور اسلام کی بنیاد قرآن وسنت کو ڈھانے کا کام کرنے کے لئے پاکستان بھیجے گئے ہیں' مولانا نے اپنے رسالہ ''بینات'' میں ایک مضمون ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اور اس کے مختلف منصوبوں کے بارے میں شائع کیا' اس مضمون میں تدوینِ فقہ اسلامی کے منصوبے کا بھی ذکر تھا' اس کا جواب ادارے کی طرف سے اس کے رسالہ ''فکر ونظر'' میں شائع ہوا' اور اس طرح ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اور مولانا محمد یوسف بنوری کے درمیان مخالفت شدید ہوتی چلی گئی' جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ ان کی طرف میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور تعلقات جو ابھی ابتدائی مرحلے میں تھے' ٹوٹ گئے' انہیں میری طرف سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے تعلق کی بناء پر بدگمانیاں پیدا ہوگئی تھیں اور مجھے ان سے یہ شکایت تھی کہ محض ادارے سے میرے تعلق کی بناء پر مولانا نے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا' مگر ان کی شخصیت رعب وجلال اور علمی ہیبت مجھ پر ایسی طاری تھی کہ یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مسئلے پر ان سے کھل کر گفتگو کروں۔

ڈیڑھ سال گزر گیا۔ ۱۹۶۵ء کے اواخر میں مجموعہ قوانینِ اسلام کی جلد اول شائع ہوگئی' ادارہ کی جانب سے مولانا کی خدمت میں بھی ارسال کی گئی' میں نے ایک دن کسی ضرورت سے مدرسے میں مولانا ادریس صاحب کو فون کیا' ریسیور مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھایا اور کہا کہ: مولانا محمد ادریس صاحب مشہور پریس گئے ہیں' پھر میرا نام پوچھ کر خیریت وغیرہ معلوم کی' میں نے ان کے لہجے میں بے ساختگی اور محبت کی گرمی پائی اور پرانی یاد تازہ ہوگئی' دوسرے دن میں مدرسے میں مولانا محمد ادریس صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا' شاید کسی کتاب کے لینے یا واپس کرنے کے سلسلے میں' میری پشت دروازے کی طرف تھی کہ اچانک مولانا ادریس صاحب نے مجھ سے کہا کہ مولانا بنوری تمہیں دیکھ کر برآمدے میں رک گئے ہیں' مولانا حدیث پڑھا کر آ رہے تھے' میں فوراً اٹھا اور جلدی سے ننگے پیر برآمدے میں آ گیا اور مولانا کو سلام کیا' مولانا نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے' خیریت وغیرہ معلوم کی اور فرمایا کہ: آپ کی کتاب پڑھ لی ہے' اس پر تبصرہ بھی ''بینات'' کے اسی شمارے میں آ رہا ہے' مولانا کے چہرے پر وہی پرانی مسکراہٹ اور لہجے میں دلآویزی تھی' میں نے مولانا سے مصافحہ کرنے کے بعد محسوس کیا

کہ میرے دل میں مولانا کی طرف سے جو کدورت تھی، وہ چھٹ گئی ہے، میں مولانا ادریس کے پاس واپس کمرے میں آیا تو وہ کہنے لگے کہ: تمہاری جلد اول مولانا نے پڑھی ہے اور ان کے خیالات تمہاری طرف سے تبدیل ہو گئے ہیں، میں نے بھی مولانا کے مصافحہ کے زیر اثر اپنے بدلے ہوئے احساسات کا ان سے تذکرہ کیا۔

کچھ دن بعد دل کا تقاضہ ہوا اور میں نے مولانا کے گھر پر فون کیا اور علیحدگی میں نصف گھنٹہ مانگا، جواب ملا، صبح آٹھ بجے آجائیے، میں گیا اور بیٹھتے ہی میں نے کہا کہ: مولانا! میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں، آپ کی مجھ سے مخاصمت ''للدین'' (دین کے لئے) تھی اور میری مخاصمت ''للنفس'' (اپنی ذات کے لئے) تھی، میں نے کچھ اور بھی عرض کیا، مگر مولانا کچھ نہ بولے، جب میں کہہ چکا تو اٹھے، سینہ سے لگایا، دعائیں دیں، مولانا آبدیدہ تھے اور میرے سچ مچ آنسو نکل آئے، یہ تھی مولانا کی شانِ عفو و درگزر۔

اس دوران میں ادارۂ تحقیقات اسلامی راولپنڈی منتقل ہو گیا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی اسلام آباد چلے گئے، میں کراچی ہی میں رہا، اکثر و بیشتر اتوار کے دن ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی عالمانہ صحبت میں بیٹھتا، جب کبھی اتوار کے علاوہ کسی دن پہنچ جاتا تو وہ معاً فرماتے: آج اتوار نہیں، آپ کیسے؟ میں عرض کرتا: آج عدالت میں کوئی پیشی نہیں تھی، سوچا آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں، غرض تعلقات کا ایک نیا باب شروع ہوا، یہ علمی مجالس تعلقات میں اضافہ کا سبب بنیں، مولانا کے لئے دل سے احترام تھا، محبت تھی۔

۱۹۶۷ء میں مجموعہ قوانینِ اسلام کی دوسری جلد میں ''تین طلاق'' کے مسئلے پر میرے اور ادارے کے درمیان اختلاف رائے اتنا شدید ہو گیا کہ کتاب کی طباعت حکماً روک دی گئی، مجھے سخت فکر لاحق ہو گئی، میں نے ساری بحث مولانا کو دکھائی جو تقریباً ستر صفحات پر مشتمل تھی، ایک ہفتے کے بعد جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا: ''طلاق الثلاث کی بحث پڑھی، ماشاء اللہ پچھلوں سے اچھا لکھا ہے۔'' شاید یہ مولانا کی حسن نیت کی برکت تھی کہ پوری بحث جوں کی توں بالآخر جلد دوم میں چھپ گئی۔

فروری ۱۹۶۹ء میں ''ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی'' کے زیر اہتمام اسلام آباد میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس کی عائلی قوانین کمیٹی کا میں سیکریٹری تھا، اراکین میں بیرونی اسکالروں کے علاوہ چند پاکستانی علماء بھی شامل تھے، لیکن میری نگاہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع کے سوائے اور کوئی ایسا عالم دین اس کمیٹی میں نہ تھا جو اپنے علم، کردار اور تقوے کے سبب دوسروں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو، میں چاہتا تھا کہ مولانا بنوری صاحب کسی طرح اس کمیٹی میں آجائیں، مولانا ایک دوسری کمیٹی برائے ''حقوق انسانی'' کے رکن تھے، مولانا نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن پر زور دے کر اپنی رکنیت تبدیل کروالی اور مجھ سے فرمایا: کسی طرح مفتی محمود بھی اس کمیٹی میں آجائیں تو بہت اچھا ہے، اتفاق کی بات جب میٹنگ شروع ہوئی تو معلوم ہوا دو ارکان نہیں آئے، ان

میں سے ایک کی خالی جگہ پُر کرنے کے لئے غالباً علامہ علاء الدین صدیقی صاحب نے ایک صاحب کا نام تجویز کیا جو منظور کرلیا گیا' وہ صاحب پہلے ہی سے کمرۂ اجلاس میں موجود تھے' دوسری نشست کے لئے جھٹ مولانا بنوری صاحب نے مفتی محمود صاحب کا نام پیش کردیا جو منظور کرلیا گیا' مفتی صاحب کو مولانا پہلے ہی مطلع کر چکے تھے' وہ اپنے کمرے میں موجود تھے۔ فوراً تشریف لے آئے۔ اجلاس کی کئی نشستیں ہوئیں' الحمدللہ! ہر اجلاس میں علماءِ حق کا پلہ بھاری رہا' خاص کر مفتی محمود صاحب تو باقاعدہ تیاری کے ساتھ نوٹ بک میں اشارات لکھ کر لاتے اور بڑے سلیقے اور سلجھے ہوئے موثر انداز میں اپنی بات اجلاس میں پیش کرتے' شاید یہ قومی اسمبلی کی رکنیت کا نتیجہ ہو۔ غرض اجلاس میں کوئی ایسی تجویز منظور نہ ہوسکی جو خلاف شرع ہو' یہ سب اللہ کے فضل وکرم اور مولانا بنوری، مولانا مفتی محمود اور مولانا مفتی محمد شفیع کے علم وتقوے کا اثر تھا' بعد میں مولانا بنوری نے کراچی واپس آکر اپنے ایک قریبی عزیز سے فرمایا: ''تنزیل الرحمٰن تو ہمارا آدمی ہے، ہم اسے حکومت کا آدمی سمجھتے تھے۔''

حسن اتفاق سے کانفرنس سے واپسی پر سفر میں میرا اور بنوری صاحب کا ساتھ ہوگیا' اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے مولانا مرحوم کی معیت کی خاطر اپنی روانگی ایک دن پہلے کرائی' جہاز میں سیٹیں بھی ہم دونوں کی برابر برابر تھیں' راستے میں مولانا بنوری موڈ میں تھے' اپنی زندگی کے اوراقِ پارینہ الٹنے شروع کئے' ڈابھیل اور مصر میں قیام کے بہت سے واقعات سنائے اور مدرسہ نیوٹاؤن کا ذکر آیا تو فرمایا کہ: ''جیسا کھانا میں اپنے طالب علموں کو کھلاتا ہوں' خود ایسا کھانا نہیں کھا سکتا' مدرسہ سے ساڑھے چار سو روپے ماہوار اپنے خرچ کے لئے لیتا ہوں' جس میں کپڑا نہیں بن سکتا' اللہ کا کوئی بندہ دے جاتا ہے تو سلوا کر پہن لیتا ہوں۔'' مولانا مدرسے سے اپنے لئے صرف بقدر کفایت لیتے تھے، ورنہ کون نہیں جانتا کہ مدرسے کی ساری آمدنی مولانا کے ذاتی اثر ورسوخ کا نتیجہ تھی او رمولانا مدرسے کے آمد وخرچ پر کلی اختیار رکھتے تھے' وہ چاہتے تو اپنی تنخواہ زیادہ مقرر فرمالیتے' پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے مولانا کو کئی ہزار روپے ماہوار پر اپنے ہاں علوم اسلامیہ کی کرسی پیش کی' پاکستان سے باہر کئی اسلامی ممالک نے پاکستان کے مقابلے میں کئی گنا ماہوار کی پیشکشیں کیں' حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ الحدیث بنانے کی تحریک ہوئی' مگر مولانا کو اپنا مدرسہ دنیا جہان کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا' وہ اسے اپنی زندگی کا حاصل اور دین کی خدمت کا اصل ذریعہ سمجھتے تھے' مولانا مرحوم مدرسے کا ذکر بڑی دل دادگی اور شیفتگی کے انداز میں کرتے تھے' انہوں نے اس مدرسے کی خاطر بالخصوص اس کے قیام کے ابتدائی ایام میں بڑی تکلیفیں برداشت کیں' اور اس کے بعد ہمیشہ قربانیاں دیتے رہے' انہیں اپنے قائم کردہ مدرسے سے صحیح معنوں میں عشق تھا' وہ اس کو دارالعلوم دیوبند کی طرح ایک عظیم دینی درسگاہ دیکھنا چاہتے تھے' مولانا میں زبردست تنظیمی صلاحیتیں تھیں' جو شاید وباید ہی علماء میں پائی جاتی ہوں' حکیم محمد

سعید صاحب نے اس مدرسے کی صفائی ستھرائی اور نظم وضبط دیکھ کر ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ: مولانا کا مدرسہ کیمبرج اور آکسفورڈ کا مقابلہ کرتا ہے' (واضح رہے کہ حکیم سعید صاحب نے یورپ وامریکہ کی اگر سینکڑوں نہیں تو درجنوں یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے دیکھے ہیں، اس لئے ان کا قول سند کا درجہ رکھتا ہے)۔

۱۹۶۹ء کے آخری ایام تھے، میں ایک دن مدرسہ گیا تو مولانا محمد ادریس صاحب جو مجھے ہمیشہ حج کرنے کی طرف متوجہ کرتے تھے، پوچھنے لگے کہ: حج کی درخواست کا کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ: واپس آ گئی' قرعہ نہیں نکلا۔ کہنے لگے کہ: اس مرتبہ مولانا بحری جہاز سے جا رہے ہیں، خوب ساتھ رہے گی' کوشش کرو کہ سیٹ مل جائے' میں نے کہا کہ: سیٹ تو مل جائے گی' مگر مجھے اسلام آباد لکھنا پڑے گا' کہنے لگے: کوئی مضائقہ نہیں' اس زمانے میں ایک مرکزی وزیر سے میرے مراسم تھے' میں نے انہیں خط لکھا، چند روز میں سیٹ کا بندوبست ہو گیا' میں نے مولانا ادریس صاحب کو اطلاع دے دی' مولانا بنوری صاحب کو جب خبر ہوئی تو مجھ سے فرمایا: ''ماشاءاللہ! آپ بھی جا رہے ہیں۔'' مجھے دراصل اس بات کی بہت خوشی تھی کہ جہاز میں مولانا بنوری صاحب سے استفادے کا خوب موقع ملے گا۔ جہاز پر شام کو مولانا سے سرسری ملاقات ہوئی اور بس' دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا' تیسرے دن مولانا ہماری طرف تشریف لائے، جہاں میں، مولانا ادریس صاحب، مولانا بدیع الزماں صاحب اور مولانا مفتی ولی حسن صاحب سب ایک جگہ تھے' مولانا مجھ سے کہنے لگے کہ: دو روز مجھے تم سے انقباض رہا کہ تم انگریزی تعلیم یافتہ ہو، وکیل آدمی ہو، ہم مولویوں کے ساتھ کیسے رہو گے؟ مگر الحمدللہ! کہ اب میرا سینہ تمہاری طرف سے کھل گیا ہے اور تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے اس طرح بات کرنے سے مجھے ناقابل بیان خوشی ہوئی اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا نے گویا میری تربیت اپنے ذمہ لے لی ہے' اور واقعتاً ہوا بھی یہی' جہاز میں قیام کے دوران اوقات کی تنظیم فرمائی' کس وقت کیا کرنا ہے' اس کی تلقین فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا کہ: مکے کی سرزمین پر جب قدم رکھو تو کسی کو حقیر نہ سمجھنا، یاد رکھنا کہ کعبہ مرکزِ تجلیات ہے' اس کے قرب وجوار میں رہنے والا خواہ کسی حال میں ہو تم سے بہتر اور درجہ ایمان وتوحید میں تم سے ہزار درجہ بہتر ہے' ہوسکتا ہے کہ تم شہر میں جگہ جگہ گندگی دیکھو یا لوگوں کی بعض عادات تمہاری ناگواری کا باعث ہوں، مگر دل پر میل نہ لانا اور تنقید (طعن وتشنیع) سے گریز کرنا' مولانا کی اس نصیحت کا دل پر خاطر خواہ اثر ہوا اور الحمدللہ! یہ نصیحت دل پر نقش ہے اور حرمین کے سفر کا جب بھی اتفاق ہوا' یہ نصیحت مشعلِ راہ رہی۔

جہاز کا ایک کمرہ ملازمین کے کلب کے لئے مخصوص تھا' جہاز والوں نے مولانا کی نشست گاہ کے لئے وہ کمرہ خالی کر دیا' اب اس میں دینی مجالس منعقد ہونے لگیں' صبح سے بارہ بجے تک لوگ آتے رہتے اور مولانا سے مسائل حج پوچھتے رہتے تھے' مولانا جوابات اپنی یادداشت سے دیا کرتے تھے' کوئی کتاب پاس نہ تھی۔ ایک دن

ایک مسئلے میں مولانا سے سہو ہوگیا' مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری (حال متوطن مدینہ طیبہ) جو اس جہاز میں ہمارے ہمسفر تھے، ملا علی قاری کی کتاب مناسک الحج لے کر تشریف لائے اور مولانا کی غلطی کی نشاندہی کی' دوسرے لوگ بھی موجود تھے' مولانا نے کتاب لے کر دیکھی اور سب کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ یہ تھی مولانا کی بے نفسی۔ جب مولانا عاشق الٰہی صاحب بعد میں مولانا بنوری صاحب سے رخصت ہونے لگے تو ان سے فرمایا کہ: یہ کتاب ایک رات کے لئے میرے پاس چھوڑ جاؤ' میں رات کو اس کا مطالعہ کروں گا' پھر مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ: بہت عرصے کی بات ہے، میں نے ملا علی قاری کی مناسک' فتاویٰ عالمگیری کی کتاب الحج خوب یاد کرلی تھی اور سمجھتا تھا کہ حج کے مسائل خوب آ گئے' خواب میں ایک مرتبہ دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ حج کے مسائل بہت مشکل ہیں، تمہارے قبضے میں نہیں آئے۔

جہاز غالباً ۴ یا ۵ ذوالحجہ کی صبح کو جدہ پہنچ گیا' مگر جہاز سے مسافروں کو اترنے کا حکم نہ تھا' اس سے پہلے ڈھاکہ سے آنے والے ایک جہاز پر چیچک کا کیس ہوگیا تھا' اس لئے ہم سب کو جہاز ہی میں قرنطینہ کے لئے روک لیا گیا' سب کو گولیاں کھانے کے لئے دی گئیں' بہت سوں نے کھائیں' بہت سوں نے پھینک دیں' غرض لوگوں میں ایک ہیجان تھا' ایسے عالم میں مولانا اگر ایک طرف سعودی حکومت کے اس امریکی طریقہ کار کے خلاف احادیث نبوی ﷺ سے استدلال فرمارہے تھے تو دوسری طرف لوگوں کو اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ واستغفار کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ایک شب بعد عشاء جہاز میں جلسہ ہوا، جس میں چند لوگوں نے تقریریں کیں' ان تقریروں میں صرف دنیا تھی اور دنیاوی طریقے، نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں بھی تقریر کرنے کھڑا ہوگیا اور حضرت مولانا کی چند نشستوں میں اس موضوع پر جو کچھ سنا تھا اور یاد تھا' وہ حاضرین کے سامنے پیش کردیا کہ یہ وقت اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ہے' سب کچھ چھوڑو' اور اللہ سے تضرع وفریاد وآہ وزاری کرو۔

جب فجر کی نماز کے بعد میں حسبِ معمول مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو کسی نے مولانا سے میری تقریر کا ذکر کردیا' دیکھتے ہی فرمایا: رات آپ کی تقریر ہوئی' ماشاء اللہ اور ابھی ہم مجلس میں بیٹھے تھے کہ لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا کہ فلاں وقت جہاز سے مسافروں کو اتارا جائے گا' راضی برضائے الٰہی رہنے کا جو سبق مولانا نے ان تین دنوں میں خاص طور پر دیا تھا' اس کا اثر اور کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ مکہ معظمہ میں معتقدین نے آپ کے قیام کا جہاں بندوبست کیا تھا' وہ اسی معلم کی عمارت کی پہلی منزل ہی میں تھا' جو میرا معلم تھا' حالانکہ مولانا کا معلم دوسرا تھا' حج کے بعد منیٰ سے واپسی پر میری طبیعت خراب ہوگئی' اسہال اور سخت بخار نے آ جکڑا' کئی نمازیں حرم میں نہ پڑھ سکا اور ایک نماز قضاء بھی ہوگئی' بیماری کی پہلی صبح کو ابھی میں پوری طرح بیدار بھی نہ ہوا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا کھڑے ہوئے ہیں اور مجھے

اٹھنے اور چائے پینے کے لئے کہہ رہے ہیں' ہاتھ میں چائے کی ٹرے ہے' جس میں چائے اور بسکٹ اور سیب رکھے ہیں' دل میں حیرانی اور ایک قسم کی ندامت بھی تھی کہ مولانا کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی' شاید مولانا کو میری علی الصبح چائی پینے کی عادت کا علم تھا' سخت بیماری کے سبب ہوٹل وغیرہ نہ جاسکتا تھا' مولانا اپنے کمرے سے چائے بنوا کر خود لے کر نیچے آئے' ساتھ ہی بسکٹ بھی تھے اور دوا کی چند گولیاں بھی' مجھے کمزوری بے حد تھی' میں نے اٹھ کر چائے پی' جب تک چائے پیتا رہا' مولانا میرے پاس بیٹھے رہے اور چند احادیث سنائیں اور تسلی دی کہ فکر نہ کرو' جلد صحت یاب ہوجاؤ گے اور دو گولیاں دیں جو وہ ساتھ لائے تھے اور واقعی یہ ان احادیث کی برکت تھی یا مولانا کی دعا کہ میں رات بھر سخت بخار میں پھنکنے کے باوجود دوسرے دن دوپہر حرم میں نماز پڑھنے چلا گیا' مولانا کے ساتھ ان کی نابینا صاحبزادی اور ایک خادمہ بھی تھی' وہ چائے خادمہ کے ہاتھ بھی بھیج سکتے تھے' مگر خود لے کر آئے' مولانا کی اس محبت و مہربانی کا نقش آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

مدینہ منورہ سے واپسی پر پاکستان کے لئے روانہ ہونے سے پہلے جدہ میں ایک روز قیام کے دوران ایک بار عمرے کا اور موقع مل گیا' میں عمرے کے لئے آیا' سعی کے بعد نماز ظہر میں اتفاقاً حرم میں مولانا سے ملاقات ہوگئی' کہنے لگے کہ: کھانا کھا کر جانا' چنانچہ بعد نماز ظہر مجھے اپنے ساتھ قاری سلیمان صاحب کے گھر موٹر میں لے گئے' جب زینے پر چڑھنے کا وقت آیا تو میں پیچھے ہوگیا کہ مولانا آگے بڑھیں' مگر مولانا نے مجھے آگے بڑھنے کے لئے کہا' میں نے جب کہا کہ مولانا آپ! تو فرمایا کہ تم اس وقت محرم (حالت احرام میں) ہو' تمہارا مرتبہ اس وقت مجھ سے بڑھا ہوا ہے' اس لئے تم آگے بڑھو' حکم کی تعمیل میں آگے ہوگیا' مگر آج تک مولانا کی یہ بات ذہن میں محفوظ ہے کہ مولانا دینی شعائر کی کس قدر تعظیم کرتے تھے۔

پاکستان واپس آکر مولانا سے ملاقاتوں کا سلسلہ حسبِ سابق جاری ہوگیا' مولانا کی عنایتوں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا' کبھی کبھی فرماتے تھے کہ: آپ ہمارے عرفاتی بھائی ہیں۔

۱۹۷۰ء میں میرا رمضان المبارک میں عمرے اور اعتکاف کے ارادے سے حرمین شریفین کے سفر کا ارادہ ہوا' مولانا بھی تشریف لے جارہے تھے' اتفاق سے میں جس ہوائی کمپنی میں اپنی سیٹ بک کرا رہا تھا' وہیں مولانا بنوری کے داماد مولانا محمد طاسین صاحب بھی مولانا کی سیٹ ریزرو کرانے کے لئے موجود تھے' اگرچہ میرا ارادہ بعد کی تاریخوں میں سفر کرنے کا تھا' مگر میں نے مولانا محمد طاسین صاحب سے پوچھ کر اسی تاریخ میں سیٹ بک کرالی' جس میں مولانا تشریف لے جانے کا ارادہ فرمارہے تھے' اور اس طرح مولانا کی معیت میں سفرِ حج کے بعد عمرۂ رمضان کی بھی سعادت نصیب ہوئی' جہاز میں ہم دونوں کی سیٹیں برابر برابر تھیں' جب جہاز جدہ اترنے والا تھا تو ہمیں کارڈ دیئے گئے' جس میں ہمیں مکہ معظمہ میں اپنے قیام کی جگہ لکھنی تھی' مولانا نے مجھ سے پوچھا تم کہاں

ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ: اپنے سابق معلّم احمد اکرم الدین کے ہاں، فرمایا کہ نہیں! تم عبدالعزیز خوگر کا پتہ لکھو، میں وہیں ٹھہروں گا اور تم میرے ساتھ ٹھہرنا اور بس اب تم میرے مہمان ہو۔ اور مولانا نے میری مہمانی کچھ اس طرح شان سے کی کہ جس کو بیان کرنے سے زبانِ قلم قاصر ہے، جہاز سے اتر کر اور بعد عید مدینہ منورہ سے روانگی تک جملہ اخراجات مولانا نے برداشت کئے، حتیٰ کہ عمرۂ اول میں سعی کے بعد بال منڈوانے کے لئے ہم دونوں بار بر کی دکان پر گئے، مولانا پہلے فارغ ہو گئے تو بار بر کو دونوں کے پیسے دے کر مجھ سے کمرے میں آ جانے کا کہہ کر چلے گئے، غرض مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں قیام وطعام اور ٹیکسی وغیرہ کے کرائے، غرض تمام اخراجات خود ادا کئے، اور اس شان سے کئے کہ مجھے لب کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، ایک دن میں کہنے لگا کہ: مولانا! آپ تو بہت مالدار ہیں، کہنے لگے کہ: نہیں بھائی، مالدار تو تم ہو، البتہ یہاں بے شک ہم مالدار ہیں۔

مکہ معظّمہ میں مولانا بنوری کے صاحبزادے مولوی محمد بنوری سلمہ بھی پہلے سے مقیم تھے، مگر مولانا نے مجھے اپنے کمرے میں جگہ دی اور محمد میاں دوسرے کمرے میں مولانا محمد اسمٰعیل بھام جی وغیرہ کے ساتھ رہے، غرض شب و روز مولانا کی معیت نے جو روحانی فیض بخشے وہ ناقابلِ بیان ہیں، صرف ایک واقعہ عرض کردوں: اکثر یہ ہوتا کہ جب رات میں میری آنکھ کھلتی تو مولانا نمازِ تہجد میں مشغول ہوتے، ایک دن جب میری آنکھ کھلی تو مولانا بیت الخلاء میں تھے، میں اٹھا اور میں نے مولانا کا بستر درست کر دیا، دوسرے دن میں کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا نے میرا بستر درست کیا ہوا ہے۔ اللہ اکبر! مولانا کی انکساری! آج بھی جب مولانا کی یہ ادا یاد آ جاتی ہے تو دل کا کیا حال ہوتا ہے، بیان نہیں کرسکتا:

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مسجد نبوی میں اعتکاف کے دوران افطار وسحری میں قسم قسم کے کھانے آتے تھے، اول اول میں نے کھانے میں کچھ تکلف کیا، مولانا نے اس کو محسوس کرلیا، مجھ سے علیحدگی میں فرمایا: ''تنزیل الرحمٰن! اگر آنحضرت ﷺ زندہ ہوتے اور ہم یہاں آتے تو ہم آنحضرت ﷺ کے مہمان ہوتے، آج آنحضرت ﷺ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں تو یہ خادمانِ رسول ﷺ جو مدینۃ النبی ﷺ کے ساکن ہیں، ہماری میزبانی کرتے ہیں، ہم رسول اللہ ﷺ کے مہمان ہیں اور یہ سب خادمانِ رسول ﷺ ہیں، تم کھانے میں تکلف نہ کیا کرو، رغبت سے کھایا کرو۔'' مولانا کا سمجھانے کا وہ پیار و محبت بھرا انداز جب بھی یاد آتا ہے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں، میں نے مرتد کے احکام پر ایک مختصر کتاب لکھی، مولانا کی خدمت میں بنظرِ اصلاح پیش کی، مولانا نے اجماع اور ارتداد کے مسئلے میں سوالیہ نشان لگا کر ''ردالمحتار'' مزید دیکھنے کی ہدایت لکھ دی۔ واقعہ یہ ہے

کہ کتاب میں یہ موضوع تشنہ تھا۔ (بعد میں یہ کتاب سلسلہ مضامین کے طور پر ''البلاغ'' کراچی اپریل ۱۹۷۲ء تا مارچ ۱۹۷۳ء بالاقساط شائع ہوئی)۔

حکومت آزاد کشمیر کو مجھے شراب نوشی کی سزا پر ایک مبسوط رائے ارسال کرنا تھی' میں نے ایک ماہ تک اس سلسلے میں تمام احادیث وروایات کا مطالعہ کیا' مگر دل میں کچھ کھٹکا رہا' میں وقت لے کر مولانا کی خدمت میں پہنچا اور اپنا اضطراب ان کے سامنے رکھ دیا۔ سن کر فرمانے لگے کہ: تم نے اس مسئلے میں ''نصب الرایہ'' اور ''فیض الباری'' دیکھی؟ میں نے کہا نہیں' فرمایا کہ: ان دو کتابوں کو دیکھ لو' انشاء اللہ کھٹکا جاتا رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی خدمت میں تھوڑے سے وقت میں وہ مسئلہ حل ہو جاتا تھا' جس میں ہفتوں سرگرداں رہتا۔

مجھ پر مولانا کی ہیبتِ علم اس قدر طاری رہتی تھی کہ ایک دو مرتبہ کے سوائے شاید ہی میں نے کبھی جارحانہ بحث کا انداز اختیار کیا ہو' میں اکثر اوقات مولانا کے ارشادات بہت صبر وسکون اور توجہ سے سنتا رہتا' البتہ بعض ضمنی سوالات جو خود مولانا کے بیان سے پیدا ہوتے تھے' ان کو نہایت ادب سے دریافت کرتا' فرماتے تھے: ''تم وکیل ہو' اس لئے نکتے خوب پیدا کرتے ہو۔ تم جیسا مخاطب ہو تو طبیعت کھلتی ہے اور بات کو جی چاہتا ہے۔'' خبر نہیں کہ میرا اندازِ سماعت اور طالبِ علمانہ شوق تھا یا مولانا کی وسیع القلبی۔

۱۹۷۲ء میں، میں نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر ''مجموعہ قوانینِ اسلام'' کی جلد چہارم کا مسودہ پیش کر کے اس پر نظر ثانی کرنے اور اس پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی' مولانا نے جلد چہارم کو جستہ جستہ دیکھا اور تفصیلی مطالعہ کے لئے مولانا مفتی ولی حسن صاحب سے کہا' اور پھر مولانا نے بہت عمدہ اردو میں تقریظ لکھی اور آخری پیراگراف سناتے ہوئے فرمایا: ''ہماری اردو خود رو ہے، ہم نے اردو کہیں پڑھی نہیں، کوئی غلطی ہو تو درست کر لینا۔'' اللہ اللہ! یہ کسر نفسی۔

ایک مرتبہ مولانا کو مجھ سے کوئی قانونی مشورہ کرنا تھا' فون کیا کہ آج ایک ضروری کام ہے۔ مغرب کے بعد آجاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ: مجھے بعد نماز مغرب قریب ہی ایک جنازے میں شرکت کرنی ہے' فرمایا: اچھا نماز یہیں پڑھ لینا، گفتگو مختصر کریں گے' میں نے نماز مولانا کے ساتھ پڑھی' میں نماز سے فارغ ہو گیا تو مجھ سے مولانا نے فرمایا ''آپ مہمان خانے میں بیٹھئے' میں وہاں آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لے آئے اور فرمایا کہ: آج میں نے اپنے معمولات مختصر کر دیئے' کیونکہ آپ کو جلدی جانا ہے' میں سمجھ گیا کہ مولانا نے آج اوّابین کی نفلیں نہیں پڑھیں' حقیقت یہ ہے کہ مولانا دوسروں کی تکلیف کا بہت احساس کرتے تھے' انہوں نے اس خیال سے کہ مجھے دیر نہ ہو جائے' اپنے اس روز کے معمولات چھوڑ دیئے' حالانکہ لوگ اپنے معمولات کے سامنے دوسروں کی تکلیف کا کم ہی خیال رکھتے ہیں' مثلاً: کہیں دعوت ہے' میزبان اور کچھ دوسرے لوگ آپ کے منتظر ہیں'

مگر آپ معمولات نہیں چھوڑتے۔

مولانا سے تعلقِ خاطر کے اس طویل عرصہ میں مجھ سے یوں تو خبر نہیں کتنی غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئی ہوں گی، لیکن ایک غلطی سخت ہوگئی اور وہ یہ کہ مولانا محمد تقی عثمانی کے ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی میں ایک سلسلہ مضامین شروع ہوا۔ ''دینی مدارس کے انحطاط کے اسباب اور ان کا تدارک'' متعدد بزرگوں نے جن میں مولانا شمس الحق افغانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی شامل تھے، اس موضوع پر مضامین لکھے، میں نے بھی اس موضوع پر ایک مقالہ سپردِ قلم کیا، جو میں نے ''البلاغ'' کو بھجوادیا، البلاغ کے مدیر مولانا محمد تقی عثمانی کو اس مضمون پر چند اعتراضات تھے، جن کا ذکر انہوں نے ایک خط میں کیا، جس کا میں نے انہیں جواب لکھ دیا، مگر انہوں نے میرے اس مضمون کو اپنے رسالے میں شائع کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ (بعد میں انہوں نے فرمایا کہ انہوں نے اس مضمون کی اشاعت خود میرے حق میں مضر سمجھی ہے، جس کا اندازہ مجھے پیش آنے والے واقعہ سے ہوگیا)۔ میرا یہ مضمون روزنامہ جسارت میں شائع ہوا، مولانا کی نظر سے گزرا، انہیں اسے پڑھ کر صدمہ ہوا، اور پھر ماہنامہ ''بینات'' کے اداریہ ''بصائر وعبر'' میں انہوں نے اس مضمون کا میرا نام لئے بغیر تعاقب کیا، اس کے بعد جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے ان کی ناراضگی کا بخوبی اندازہ ہوگیا، مگر مجھے ان کی ہیبتِ علمی کے سبب کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی، لیکن چونکہ میرے اس مضمون میں غلطی کی بنیاد ''عدم واقفیت'' تو ہوسکتی تھی، الحمدللہ! ''عناد یا دشمنی'' ہرگز نہ تھی، اس لئے نیتوں کی برکت سے کچھ عرصے بعد الحمدللہ! مولانا کے دل پر چھایا ہوا غبار خود بخود دور ہوگیا۔

۱۹۷۷ء کے رمضان (آخری) عمرہ رمضان کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو مولانا سے ملاقات کے لئے گیا اور اس خیال سے کہ مولانا مصروف ہوں گے، گھر پر جانے کے بجائے ظہر کی نماز مسجد میں پڑھی کہ وہیں پر ملاقات بھی ہوجائے گی، ملاقات ہوئی، چند باتیں ہوئیں، مولانا کے داماد مولانا حبیب اللہ مختار صاحب نے مولانا کو کسی کام کا ذکر کرتے ہوئے جلد اٹھنے کے لئے اشارتاً متوجہ کیا تو مولانا نے فرمایا ''چند منٹ اور'' تاکہ ان کا حق ادا ہوجائے، آخر اتنی دور سے ملاقات کرنے آئے ہیں، اس چھوٹی سی بات میں حقوق العباد کی ادائی کا کیا لطیف سبق دیا۔

اسی صحبت میں مجھ سے فرمایا ''کہ آپ کے بھائی (حفیظ عتیق الرحمٰن سلمہ) جو مولانا کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضر ہوتے رہتے تھے اور جن سے مولانا بہت محبت فرماتے تھے، غالباً مجھ سے بھی زیادہ، اور کیوں نہیں۔ ماشاءاللہ وہ ظاہری اور باطنی اوصاف میں اور دینی لحاظ سے مجھ سے بہت بہتر اور بلند تر ہیں اور شرع میں اصل اعتبار دین ہی کا ہے) آئے تھے، میں نے ان سے دعا کا وعدہ کرلیا، انشاءاللہ! ان کے حق میں دعا کریں گے۔'' میں نے سوچا کہ مولانا کو اپنے وعدے کا کس قدر پاس ہے، حالانکہ ہم لوگ باہم دعا کے لئے اکثر درخواست

کرتے رہتے ہیں اور وعدہ بھی کر لیتے ہیں، لیکن اس وعدہ کی تکمیل کا اہتمام شاید اکثر نہیں کرتے، مولانا کو دیکھئے اور وعدے تو درکنار دعا جیسے وعدہ کا بھی یہ التزام، میرے لئے مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت دعائیں کرتے تھے۔ (آخر عمر میں مفتی صاحب سے تعلق ارادت زیادہ ہوگیا تھا) اور عتیق میاں کے لئے حضرت بابا نجم الحسن صاحب، ۷۶ء کے رمضان المبارک میں بابا صاحب کے ہاں چلے گئے، ۱۱ شوال کو حضرت مفتی صاحب بھی رخصت ہوگئے، میں نے عتیق سلمہ سے کہا کہ: تمہارے دعا کرنے والے بھی چلے گئے اور ہمارے بھی، اس وقت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ ہم دونوں بھائیوں کے لئے دعا کرنے والوں کی الحمدللہ! کمی نہیں۔

انتقال سے کچھ عرصہ قبل میں نے حاضر ہوکر ''مجموعہ قوانینِ اسلام'' کی جلد پنجم کا مسودہ پیش کیا، فرمانے لگے کہ: اب نگاہ کمزور ہوگئی ہے، ٹائپ کے پڑھنے میں دشواری ہوگی، کتاب کی طباعت شروع ہوچکی تھی، میں نے طبع شدہ سو صفحات پیش کئے، وعدہ کیا کہ انشاء اللہ! جلد فرصت نکال کر اس کا مطالعہ کروں گا اور کچھ لکھوں گا۔ انتقال سے تقریباً ایک ماہ قبل فون پر بتایا کہ آپ کی کتاب کا مطالعہ شروع نہیں کر سکا ہوں، کیونکہ مشاورتی کونسل کا کام آ گیا، کیا خبر تھی کہ کونسل کا کام بالآخر ان کا کام تمام کردے گا، مولانا مرحوم سے میری یہ آخری گفتگو تھی۔

مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف پاکستان، بلکہ عالمِ اسلام کی ایک برگزیدہ شخصیت تھے، ان کی ذات علوم نبوت کا گنجینہ تھی، وہ عام علماء کے برعکس بہت زیادہ خاطر ومدارت کرنے والے تھے، لیکن دینی معاملات میں انتہائی سخت واقع ہوئے تھے، غیرتِ دینی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی خیال، کوئی خطرہ اور خوف انہیں حق کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتا تھا، وہ اللہ کے نڈر اور بے باک سپاہی تھے اور دینِ اسلام کی بقاء کے لئے ہر لمحہ سربکف رہتے تھے۔

مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ، علمِ حدیث میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے، وہ حدیث کے اسرار ورموز کے جاننے والے اور ان کے ظاہر کرنے والے تھے اور ساتھ ہی اس پر عامل بھی تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع تھا، عربی زبان وادب پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی، کسی زمانے میں عربی زبان میں شعر بھی کہتے تھے، بے تکان عربی بولتے اور لکھتے تھے، اس برصغیر میں شاید ہی مولانا سید ابوالحسن ندوی (علی میاں فرنگی محلی) کے سوا عربی لکھنے اور بولنے میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، مولانا کی متعدد تصانیف ہیں، لیکن ان کا زبردست علمی کارنامہ ''معارف السنن'' ہے جو ترمذی کی شرح ہے، افسوس کہ یہ شرح مکمل نہ ہوسکی۔

مولانا کا حافظہ غضب کا تھا، جو کتابیں چالیس سال پہلے پڑھی تھیں، ان میں سے بہت سوں کے اقتباسات انہیں ازبر تھے۔

ان کا ذوق بڑا پاکیزہ اور نفیس تھا' ہر چیز میں نفاست، شائستگی کو پسند فرماتے تھے' مدرسہ میں بھی صفائی کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ راستے میں کوئی تنکا تک پڑا نظر نہ آتا تھا۔

وہ سلسلہ تصوف میں حضرت مولانا محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نگینوی ثم لکھنوی ثم مہاجر مدنی سے بیعت تھے' پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے' وہ عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے' مگر اس کے اظہار سے کتراتے تھے' عصر تا مغرب مسجد میں ملحق مدرسہ کے لان میں مولانا تشریف رکھتے' عام مجلس اور علوم و معارف کے خزانے لٹائے جاتے' آخری زمانہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے فرمانے کے بعد جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کا ایک رسالہ پڑھا جاتا اور مولانا کہیں کہیں کسی نکتہ کی وضاحت فرماتے۔

شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا عام علماء کے برخلاف مسلسل مطالعہ کرتے رہتے تھے اور جدید تحقیقات سے خود کو باخبر رکھتے تھے' مگر اس کا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے' حتیٰ کہ ایک مرتبہ جب عارضہ قلب میں مبتلا ہوئے اور ڈاکٹر نے آرام کی ہدایت کی' اس وقت بھی انہوں نے شیخ الازہر الشیخ عبدالحلیم محمود کی نئی تصنیف جو تصوف کے موضوع پر تھی اور چار پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے' بستر علالت پر لیٹے لیٹے پڑھ ڈالی' جب افاقہ ہوا اور ڈاکٹر نے ملاقات کی اجازت دے دی تو میں عیادت کے لئے گیا تو اس وقت کا مجھ سے ذکر کیا اور اس کتاب کی بہت تعریف کی اور شیخ الازہر کی (جن کے ساتھ میں حکیم سعید صاحب کے ہاں ایک دعوت میں شریک ہو چکا تھا) بے حد تعریف کی اور مجھ سے ان کے ذاتی اوصاف بالخصوص موصوف کے ''صوفی باصفا'' ہونے کا ذکر کیا اور فرمایا کہ: اس وقت عالمِ اسلام میں ان جیسی شخصیت نہیں ہے' کچھ عرصہ قبل مولانا نے مشہور مصری عالم علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کی مجھ سے بہت تعریف کی تھی' مولانا علامہ زاہد الکوثری مرحوم کی علمیت سے بہت متاثر تھے۔

مولانائے محترم اللہ تعالیٰ کی رزاقیت اور قدرت پر بے پناہ یقین رکھتے تھے' اس یقین میں اس قدر پختگی اور قوت تھی کہ ان کے پاس بیٹھنے والا اور ان کی باتیں سننے والا ان کی مجلس سے ''یقین'' کی دولت کا کچھ نہ کچھ حصہ لے کر ضرور اٹھتا تھا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت حضرت بابا نجم الحسن صاحب (جن کی خدمت میں مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ میرے ہمراہ تشریف لے گئے تھے) فرماتے تھے کہ: ہم مسلمانوں میں یقین کی کمی ہے' اس لئے ہمارے کام ناقص ہوتے ہیں۔ مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ قرآن و حدیث کے حوالوں سے اس دولتِ یقین اور اس کے ابدی ثمرات کا اس طرح نقشہ کھینچتے تھے کہ سننے والا مبہوت رہ جاتا تھا۔

مولانا جب افریقہ کے دورہ سے واپس آئے تو اس سفر کے حالات و کوائف سناتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ: افریقہ میں جنت کمانا بہت آسان ہے' وہاں اسلام کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے' لوگ دعوت کے منتظر ہیں' راہ حق کی تلاش میں ہیں' فرماتے تھے کہ: اگر میں جوان ہوتا تو سواحلی زبان سیکھ کر وہیں رہ جاتا اور تبلیغِ اسلام

کرتا۔ (شاید اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے مجلس دعوۃ والتحقیق الاسلامی کے نام سے ایک علیحدہ ادارہ کی بنیاد رکھی) فرماتے تھے کہ: ایک کام کے لئے ایک آدمی کافی ہے، بشرطیکہ وہ تن من دھن سب کچھ اس کام کی نذر کردے۔

شرط آنست کہ مجنون باشی

ایک مرتبہ مولانا کے حج مبارک سے واپسی پر شرف نیاز حاصل کرنے مکان پر حاضر ہوا، تو فرمانے لگے کہ: اس بار بھی تمہارے حق میں بیت اللہ میں دعا کی تھی، پچھلے سال بھی کی تھی، مگر قبول نہیں ہوئی، میری خواہش ہے کہ تم وکالت کے پیشے کو خیر باد کہہ کر اور مخلّی بالطبع ہوکر اسلامی قوانین کی تدوین میں لگ جاؤ، بہتوں سے سنا ہے کہ: مولانا مستجاب الدعوات تھے، دیکھئے میرے حق میں یہ دعا کب اور کیوں کر مقبول ہوتی ہے؟

مولانا شہرتِ طلبی کو سخت برا سمجھتے تھے، انہوں نے ایسے تمام راستوں کو بند کردیا تھا جو شہرت کا سبب یا ذریعہ بن سکیں، حتیٰ کہ مدرسہ میں بھی کبھی کوئی جلسہ تقسیم اسناد یا دستار بندی منعقد نہ کیا، ختم نبوت کے قادیانی مسئلے میں مولانا مرحوم نے پورے ایک سو دن شب و روز کام کیا، اس میں بھی ان کا یہی طرزِ فکر تھا کہ جو کچھ کرو، اللہ کے لئے کرو، شہرت کے لئے نہ کرو۔ اس زمانے میں بعض فرضی نام نہاد انجمنوں کے نام سے آپ کے خلاف مختلف اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات شائع کرائے گئے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ان اشتہارات کے بل کہاں سے اور کس مد سے ادا کئے گئے، لیکن مولانا نے اشتہارات کا سرے سے کوئی نوٹس ہی نہ لیا اور کوئی جواب شائع کرانے کا انہیں خیال تک نہ آیا، وہ دین کے کام میں ہر قسم کی قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ان کے نزدیک ذاتی عزت و ذلت کی دین کے کام کے سامنے کوئی اہمیت نہ تھی، وہ دین کے راستے میں ہر سختی اور دشواری کو اپنے لئے رحمت اور سامان سفر سمجھتے تھے۔

مولانا پسند و ناپسند (Likes and Dislike) کے آدمی تھے، مداہنت و منافقت ان کے مسلک میں جرمِ عظیم تھی، جس کو چاہتے ٹوٹ کر چاہتے اور جس کو ناپسند کرتے، کسی دوسرے کی زبانی اس کے ذکر سے بھی انہیں تکلیف ہوتی۔ ایک مرتبہ بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ایک بااثر وفاقی وزیر کراچی آرہے تھے، ایک انجمن ان کو ظہرانہ میں بلا رہی تھی، کچھ گفتگو بھی مقصود تھی، دو ایک مولوی صاحبان بہت کوشاں تھے کہ مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس میں شرکت فرمالیں، اس وقت مدرسے میں اتفاقاً میں موجود تھا۔ مفتی محمد شفیع صاحب سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، اس وقت کے ماحول سے مجھے کچھ گھبراہٹ ہورہی تھی، میں جلدی چلا آیا، چند روز کے بعد میں مولانا کی خدمت میں گیا تو اس بارے میں دریافت کیا۔ فرمانے لگے: میرا جی اندر سے نہ چاہتا تھا، مگر ان مولوی صاحب کا مفتی محمد شفیع صاحب سے رشتہ داری کا تعلق تھا، اس لئے خاموش رہا

اور اقرار یا انکار کچھ نہ کیا' چاہتا تھا کہ پہلے مفتی صاحب سے بات ہوجائے۔ مفتی صاحب اور میری دونوں کی رائے ہوئی کہ ہمیں اس میں شرکت نہ کرنی چاہئے' چنانچہ ہم دونوں میں سے وہاں کوئی نہ گیا' پھر خدا کی شان دیکھئے کہ دوسرے دن ان وزیر صاحب کا فون آیا کہ میں مدرسہ آنا چاہتا ہوں' میں نے کہا: تشریف لے آئیے' چنانچہ وہ آئے' میں نے ان کی چائے وغیرہ سے خاطر تواضع کی' مگر ساتھ ہی بھٹو حکومت کے لادینی اقدامات اور ملک میں بڑھتی ہوئی بے دینی کی طرف ان کی توجہ دلائی' موقع اچھا تھا۔

مولانا کی وفات حسرت آیات قومی، ملی اور میرا ذاتی ناقابلِ تلافی نقصان ہے' مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی سے ان کی ایک تقریر میں، میں نے سنا تھا کہ جب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو مفتی کفایت اللہ مرحوم نے فرمایا تھا کہ: عامۃ الناس تو مسائل معلوم کرنے کے لئے ہم سے رجوع کرتے ہیں' اب مسائل معلوم کرنے کے لئے ہم کس سے رجوع کریں گے؟ جب مفتی محمد شفیع صاحب کا انتقال ہوا تو میں نے مفتی کفایت اللہ صاحب کی اس بات کی روشنی میں سوچا کہ مولانا بنوری موجود ہیں' گو فقہ میں مفتی صاحب کا درجہ بہت بلند تھا' لیکن مولانا بنوری انشاء اللہ مفتی صاحب کی کمی محسوس ہونے نہ دیں گے' لیکن اب جب مولانا بنوری بھی ہم سے رخصت ہوگئے اور علومِ نبوت کا جگمگاتا آفتاب' عدم کے اندھیروں میں چھپ گیا تو اب تاریکی ہی تاریکی ہے۔ میں نے تدوینِ فقہ کی نصف منزل طے کی ہے' یعنی دس جلدوں کے منصوبے میں سے پانچ جلدیں مکمل ہوئی ہیں' ابھی بقیہ پانچ جلدیں باقی ہیں۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ضرور میری مدد فرمائیں گے اور اگر خدانخواستہ یہ کام پورا نہیں ہوا تو بھی اللہ ہی کی مرضی ہوگی۔ قبلہ مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا: کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کام تم نے کیا ہے؟ تمہیں کیا خبر تمہارے لئے کون کون دعائیں کرتا ہے' انشاء اللہ! مفتی صاحب، بنوری صاحب اور دوسرے علماء حضرات اور بزرگوں اور عزیزوں کی دعائیں، جس کی طرف مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اشارہ فرمایا تھا' بارگاہ رب العزت میں مقبول ہوں گی اور تدوینِ فقہ اسلامی کا منصوبہ انشاء اللہ العزیز! اس ناچیز، احقر ناکارہ کے ہاتھوں پورا ہوگا، ضرور پورا ہوگا۔

باتیں ذرا زیادہ لمبی ہوگئیں' مگر کیا کروں۔ بقول عرفی:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی مولانا کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا گیا' اور اگر کہا گیا ہے تو شاید اتنا ہی جتنا کہ دریا میں ایک کوزہ۔

المختصر! میں اس امر کو اپنی انتہائی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں نے ابا جی مرحوم و مغفور (حافظ خلیل الرحمٰن

نگینوی رحمۃ اللہ علیہ) کی زبانی گھر میں بچپن میں دیوبند اور تھانہ بھون کے جو قصے اور بزرگانِ سلف کے جو واقعات سن رکھے تھے‘ان کی عملی تصویر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی مثالی سیرت وکردار میں الحمدللہ! اپنی آنکھوں سے دیکھی:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است

سوچتا ہوں کتنے خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جنہوں نے ان بزرگوں کے بزرگوں کو دیکھا ہوگا اور ان سے اکتسابِ فیض کیا ہوگا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

''کامیابی و ناکامی تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔نتائج ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔مسئولیت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تمام آسمانی ہدایات پر عمل کرنے کا جیسے حکم ہے،اس کی تعمیل کرنی ہوگی۔ (بصائر وعبر۔رمضان المبارک،۱۳۸۸ھ)

.....☆.....☆.....☆.....

''اسلام نے انسانیت کے اعمال و اخلاق کے تزکیہ کے لئے شر و فساد کے تمام راستوں کو مسدود کردیا۔شرک جو اسلام کی نظر میں سب سے بڑا ظلم ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ وہ دنیا میں مجسموں،مورتیوں اور فوٹوؤں کے ذریعہ آیا تھا۔اس لئے اسلام نے اس منبع کفر و شرک کو حرام اور تصویر سازوں کو ملعون اور بدترین خلق قرار دے کر اس راستہ کو بند کیا۔

(بصائر وعبر،شعبان المعظم،۱۳۸۸ھ)

.....☆.....☆.....☆.....

''آج علماء کے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ضرورت ہے کہ ہم حق کہیں اور حق کے لئے کہیں۔اور حق تعالیٰ جل مجدہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کہیں اور جو کام کریں نفس کا شائبہ تک اس میں نہ ہو۔ (بصائر وعبر،محرم الحرام ۱۳۸۹ھ)